URDU STUDIES vol 2 issue 1 2022 Pages 7-12

اداریہ

اردو شعر و ادب کا خمیر حب وطن اور قوم پسندی دونوں ہی کے امتزاج سے تیار ہوا ہے، اور اس کے لیے مثالیں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اردو کی ابتدا کے سلسلے میں صوفیائے کرام یا بزرگان دین کے جن اقوال کو بطور حوالہ پیش کیا جاتا رہا ہے وہ بھی یہاں کی کثیر ثقافتی تہذیبی صورت حال کی ہی آئینہ داری کرتے ہیں۔ نو آبادیات کے دوران برصغیر میں جہاں ایک جانب استعمار کاروں کے ذریعہ مقامی آبادی کو "مہذب بنانے" کا عمل جاری تھا وہیں دوسری جانب اردو اپنی تہذیبی اقدار کی نمائندگی بھی کر رہی تھی۔ اسی کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں کو "کامل درجے کی سویلیزیشن" اختیار کرنے کی جانب راغب کیا جا سکے، اس مقصد سے سید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" کا اجرا بھی کر دیا تھا۔ ان تہذیبی آمیزشوں کے جو گوناگوں پہلو ہمارے شعر و ادب میں ابتدا سے ہی موجود ہیں ان کی مثالیں کسی اور ہندوستانی زبان کے ادب میں دشوار یاب ہیں۔ اردو شعر و ادب میں ہندوستانی تہذیب کی یہی نمائندگی اسے "اردو تہذیب" کی شناخت بھی عطا کرتی ہے۔

گذشتہ چار دہائیوں میں اردو میں ادبی نظریہ سازی کی صورت میں جو ادب منظر عام پر آیا ہے اس کے خاطر خواہ حصے کا تعلق اسی تہذیب کے عوامل و علائم کی تلاش اور تشکیل نو سے ہے جس کی گرفت تفہیم مختلف صورتوں میں کی گئی ہے۔ ان میں خالص مغربی انداز نظر بھی ہے، خالص مشرقی طریقۂ کار بھی، تعمیری نقطۂ نظر بھی اور ان سب کا امتزاج بھی۔ ہم یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ ادبی روایتوں کی جانچ پرکھ کی کلیہ سازی یا نظریہ سازی کے لیے متعین کیے گئے ان پیمانوں میں اس مشرقی شعریات کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے جس کے ڈانڈے ایرانی، عربی اور سنسکرت شعریات سے ملتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں ہم سے جدا ہونے والے اصحاب نقد و نظر میں شمس الرحمن فاروقی، شمیم حنفی، گوپی چند نارنگ اور

ابوالکلام قاسمی کی تحریریں اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان سے بھی قبل شکیل الرحمن یہ کارنامہ انجام دے چکے تھے۔ ان حضرات نے اردو شعر و ادب کی تخلیق میں ایسے عناصر کی کامیاب جستجو کی ہے جو اسے کسی مخصوص مذہب یا قوم کی بجائے ایک ہندوستانی، بالفاظ دگر، قومی شناخت عطا کرتے ہیں۔ آپ چاہیں تو تفہیم کی سہولت کے لیے اسے ادب کا سیکولر کردار کہہ سکتے ہیں۔

معاصر ادبی ڈسکورس میں مابعد نوآبادیات نے قوم پرستی، مابعد جدیدیت، سیکولر، لبرل ہیومنزم اور مارکسزم وغیرہ کی تعلیمات پر اپنی بنیادیں استوار کرنے کے دوران بڑی حد تک ایک روحانی جہت، یعنی، مذہب کو نظر انداز کر دیا تھا۔ تاہم ۱۱/۹ کے بعد جب مذہب "عالمی واپسی" کے عمل سے گزرنے لگا تو مابعد نوآبادیاتی نقادوں اور نظریہ سازوں نے مذہب اور روحانیت کے سوالات میں الجھنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کو بعد از نوآبادیاتی تجزیہ کے زمرے کے طور پر تسلیم کرنے کی غیر مغربی مابعد نوآبادیاتی فکر کی وجہ سے مابعد نوآبادیات نے مابعد سیکولر ڈھب اختیار کر لیا۔ مذہبی اور سیکولر دونوں معاملوں میں افہام و تفہیم کے لیے منفرد علمی اور تنقیدی مکالمے بروئے کار آنے لگے۔ اردو مطالعات کے ضمن میں اس کے غیر مذہبی یا سیکولر مزاج کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر ناصر عباس نیر نے حالی کے حوالے سے قومی شاعری پہ بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مابعد نوآبادیاتی مطالعات میں قوم اور تخیل کے باہمی تعلق پر خیال انگیز بحثیں ہوئی ہیں۔ اس قومی تخیل میں مذہب، نسل، زمین اور زبان سب شامل تھے۔

ہمیں علم ہے کہ مسلمانوں اور مذہب کے سلسلے میں مابعد نوآبادیاتی نظریہ کے بنیادی مفکرین میں ایڈورڈ ڈبلیو سعید کی خدمات وسیع ہیں۔ کلیئر چیمبرس نے اقرار کیا ہے کہ اسلام سے سعید کی وابستگی بروقت بھی تھی اور ضروری بھی۔ اگرچہ ۱۹۸۱ میں ان کی اہم کتاب Covering Islam کی اشاعت کے بعد عالمی منظرناموں میں سے کئی متغیر ہو چکے ہیں، اس کے باوجود مسلمانوں کی منفی نمائندگی کے سلسلے میں بہت کم تبدیلی آئی ہے۔ ۱۹۹۷ میں اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے تعارف میں سعید نے لکھا تھا کہ اصطلاح اسلام کا بظاہر مطلب ایک سادہ سی شے ہے لیکن در حقیقت اس کا کچھ حصہ تو فسانہ ہے، کچھ نظریاتی لیبل، اور کچھ حصہ ہی ایسا ہے جو اسلام نام کے مذہب کو صحیح معنوں میں پیش کرتا ہے۔ اس پس منظر میں یونیورسٹی اوف یورک میں عالمی ادب کی استاد Claire Chambers نے اپنی کتاب British Muslim Fictions میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ بہت سے مرکزی دھارے کے مصنفین اور صحافیوں کی اسلام اور مسلمانوں کی تصویر کشی کو بذات خود افسانوں کی اقسام کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ثقافتی مطالعات کی کتاب Framing Muslims میں، پیٹر مورے اور امینہ یقین نے سعید کی نظریاتی خدمات کی

اہمیت کا اقرار کرتے ہوئے یہ مشاہدہ پیش کیا کہ ان کی تحقیق قارئین کو اسلام کے گرد حصار بند اور محدود تصوراتی فریم ورک پر غور کرنے کے قابل بناتی ہے۔ سعید نے Orientalism کی اشاعت کے بعد ۱۹۸۳ میں شائع اپنی کتاب The World, the Text, and the Critic میں سیکولر تنقید کی وضاحت کرتے ہوئے اس پہلو پہ اصرار کیا تھا کہ ہمیں انسان اور پھر بطور نقاد دونوں ہی صورتوں میں اپنی شناخت قائم رکھتے ہوئے اپنی وفاداریوں کا ثبوت پیش کرنا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نسبی، نسلی اور دنیا سے وابستگی کے دیگر پہلو ایسے ہیں جن کی روشنی میں یا جن کے زیر اثر ہماری زندگی نمو پاتی ہے، مزید بر آں، ان کے ہی سبب دنیا اور انسانی زندگی کے سلسلے میں کوئی واضح نقطۂ نظر نمایاں ہوتا ہے۔ کوئی بھی متن خواہ جتنا بھی منفرد اور نایاب کیوں نہ ہو، وہ اسی دنیا کی پیداوار ہے، اسے اسی دنیا میں تخلیق کیا گیا، اسی دنیا کے قاری اور نقاد اسے پڑھتے ہیں۔ اس بنا پر سیکولر تنقید کی بہترین صورت وہ ہوگی جو دنیاوی بھی ہو، یعنی، جس میں یہ تسلیم کیا جائے کہ متن کا وجود زندگی کی ضرورتوں اور تاریخ سے ماورا نہیں ہے۔ سیکولر تنقید کا سعید کا تصور بنیادی طور پہ تمام عقائد کے خلاف مزاحمت کے ساتھ ہی سیاسی نظام کی تکمیل کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے "مغربی کینن" کو نشانہ بناتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ کس طرح مسیحی بیانوں نے کلاسیکی ادب کی صورت تبدیل کر دی تھی۔ اس سے قبل وہ یہ بھی ثابت کر چکے تھے کہ مشرقی علاقوں کی مغربی ثقافتی نمائندگیوں نے سامراجی علاقوں پر یورپی حکمرانی کو قانونی حیثیت دینے میں براہ راست تعاون کیا تھا۔ اسی نکتے کو پیش کرتے ہوئے گایتری سپیوک نے ۱۹۸۵ میں شائع اپنے رجحان ساز مضمون Can the Subaltern Speak میں لکھا تھا کہ ہندو قوانین پہ لکھی John Duncan Martin Derrett کی ایک کتاب میں یہ بیان موجود ہے کہ انگریز حاکموں نے ہندوؤں کے درمیان ستی کی رسم کے خلاف کسی بھی ہندو مرد کی رضامندی کے بغیر قانون نافذ کیا تھا۔ غیر مہذب قوم کو مہذب بنانے کی مغربی استعماریت کی اسی خود ستا ذہنیت کے لیے سپیوک نے اپنا یہ مشہور استہزائی مقولہ پیش کیا تھا: White men are saving brown women from brown men۔ اسی کی روشنی میں مریم کوک نے لکھا ہے کہ قہوہ رنگ خواتین کو قہوہ رنگ مردوں کے مظالم سے بچانا جنگ کے اعلان کا جواز بن گیا جس نے جنوبی ایشیا میں تہذیبی مشن کو آگے بڑھایا۔ یہی معاملہ دنیا کے دیگر خطوں، بالخصوص افغانستان، میں امریکی حملوں کے ساتھ بھی تھا۔ یہ اسی دنیاوی تعلق کا نتیجہ ہے جس کی جانب سعید نے اشارے کیے ہیں۔

دراصل دنیاوی یا سماجی وابستگی کو سیکولر رجحان کے طور پہ دیکھا جا سکتا ہے لیکن جذباتی وابستگی یا نسبی تعلق یا خاندانوں اور قبیلوں کے تعلقات براہ راست مذہب یا عقیدہ سے جوڑ دیے جاتے ہیں۔ اسی لیے

تنقید کو خود تنقیدی ہی نہیں، خود اضطراری بھی ہونا چاہیے، شکوک و شبہات پر مبنی، نقاد کی اپنی ذہنی رو (جس کے پس منظر میں تمام دنیاوی اور نسبی عوامل موجود ہوں)، اپنے ادارے کو مقصد یا قدر کے لحاظ سے غیر جانبدار سمجھے بغیر۔ وہ کلیدی لفظ جسے سعید "سیکولر" کے علاوہ تنقید سے جوڑتے ہیں وہ "مخالف" یا "مخالفت" ہے۔ وہ ایک ایسے تنقیدی شعور کا مطالبہ کرتے ہیں جو مزاحم ہو اور مجموعی تصورات، اصلاح شدہ اشیا، گلڈز، خصوصی مفادات، سامراجی جاگیروں، اور ذہن کی راسخ العقیدہ عادات کی مخالفت کا اہل ہو۔ سعید کے بمقابلہ، مابعد نو آبادیات کی "مقدس تثلیث" کے دیگر دو ارکان، گایتری سپیوک اور ہومی کے بھابھا کے یہاں اس موضوع سے فرار کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً سپیوک نے A Critic of Postcolonial Reason میں اسلام کا صرف ایک مرتبہ براہ راست ذکر کیا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی نظریاتی مباحث سے اسلام کو نظر انداز کیے جانے کے باوجود، پچھلے چند برسوں سے دانشوروں کا ایک گروہ اس میں دلچسپی کا اظہار کر رہا ہے۔ ایک ساتھ اور آزادانہ طور پر کام کرتے ہوئے، ریحانہ احمد، امینہ یقین، پیٹر مورے اور Geoffrey P. Nash نے اہم کام کیے ہیں۔ برطانوی مسلمان دانشور عمومی طور پر طویل عرصے سے متعلقہ موضوعات پہ تصانیف پیش کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں، بقول چیمبر، مشرق وسطیٰ میں مقیم ایک نوجوان اسکالر علاء الغامدی کی ۲۰۱۱ کی تصنیف Transformations of the Liminal Self اور ہندوستان کے عبد الرحیم قدوائی کی ۲۰۱۶ میں مطبوعہ Believing and Belonging: Critical Essays on British Muslim Fiction، اور وائل حسن کا امیگرینٹ بیانیہ وغیرہ کلچر، ڈائسپورا، اور جدیدیت کے حوالے سے مغربی بیانیوں میں اسلام اور مسلمانوں کے تشخص کے مطالعہ کے لیے نمائندہ تحقیقیں ہیں۔

ہمیں علم ہے کہ مذہبی موضوعات میں دلچسپی رکھنے والا ادب ہمیشہ دنیا بھر کی ادبی روایات کا حصہ رہا ہے اور انگریزی ادب بھی اس سلسلے میں مستثنیٰ نہیں ہے۔ لیکن اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مغربی بیانیے اور ذرائع ابلاغ انہیں اس تاثر کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کے بارے میں ان کے موافق عالمی نقطہ نظر پیدا کیا جا سکے۔ یہی نہیں، اسلامی عقائد اور مسلمانوں کے سلسلے میں ایسی مسخ شدہ تصاویر اور من گھڑت خیالات، جو عام طور پر بعض مخصوص واقعات کے حوالے سے مغربی نمائندگی کو نمایاں کرتی ہیں، مشرق کی انگریزی روایتوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مذہب اسلام اور مسلم ثقافتوں کی بڑی حد تک منفی اور خود غرضانہ تصویر کشی بھی مغربی تہذیب اور اسلام کے درمیان تصادم کا نتیجہ رہی ہے۔ مغربی انگریزی بیانیے انہیں شہوانی، قدیم، جاہل، درندوں اور غلاموں

کے تاجر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ۱۱/۹ کے بعد حالات مزید ابتر ہو گئے ہیں۔ یہ بیانیے مسلمانوں کے لیے دہشت گرد، پاگل، بنیاد پرست اور خون کے پیاسے جیسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ ادبی تخلیق کے اس خطرناک رجحان نے مسلمانوں اور عالمی برادری کے درمیان خلیج کو مزید بڑھا دیا ہے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ وی ایس نائپول کی Beyond Belief جیسی کتاب کو اسلام کے سلسلے میں تفہیم کی نئی سطح کے طور پر سراہا جا رہا ہے۔ حالانکہ نائپول نے یہ ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ جو کچھ "معلوم" کیا گیا تھا وہ اسلام نہیں تھا بلکہ اسلام کی متعصبانہ تفہیم تھی۔ "تہذیب کاری" کے دوران اسلام اور مسلمانوں کو شیطانی بنانے کا یہ رجحان استعماری ایجنڈا تھا اور دنیا آج بھی اس کا شکار ہے۔

اسلام اور مسلمان زمانوں سے مغربی اسکالرز اور میڈیا کے درمیان بحث کا موضوع رہے ہیں اور ان سے متعلق تصاویر اور گفتگو اکثر منفی ہی رہی ہیں۔ تاہم، ان کی تصویر کشی مغربی مباحثوں میں کبھی بھی اتنی زیادہ شیطانی اور پر فتن نہیں رہی جتنی کہ حالیہ ادوار میں کہ جب انھیں خوف اور خطرے کے ذرائع کے طور پر بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ جیک جورج شاہین کا استدلال ہے کہ عرب دنیا کی وہ واحد تصویر امریکیوں کی اکثریت جس سے روبرو ہوتی ہے، وہ اس کا ہالی ووڈ ورژن ہے، جو تقریباً بغیر کسی استثنا کے سادہ اور منفی ہے۔ اس موضوع پر لکھے گئے ادب کی ایک بڑی تعداد میں، ۹۰۰ سے زائد فلموں کے مطالعہ پر مبنی، Reel bad Arabs: How Hollywood vilifies a people، میں شاہین نے واضح کیا ہے کہ کس طرح فلم دیکھنے والوں کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ تمام عرب مسلمان ہیں اور تمام عرب، مسلمان عرب ہیں۔ فلم سازوں کی مسخ شدہ عینکوں نے عربوں کو بے رحم، سفاک، غیر مہذب، مذہبی جنونیوں کے طور پر دکھایا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سب نو آبادیاتی خصلتیں تھیں۔ وہ مسلمانوں سے خوفزدہ تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یورپ مسلم حکمرانوں کا گڑھ ہے اور وہ طویل عرصے سے رعایا کے طور پر رہ رہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اسلام، مسلمانوں اور مسلم ریاستوں کو شیطانی بنانے کی پوری کوشش کی۔ یہ اسلام کے خلاف ایک قسم کی نفسیاتی جنگ تھی۔ انھوں نے اسلام کو نشانہ بنانے کے لیے استعمار کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ یہ نظریاتی جنگ دنیا کے کئی حصوں میں آج بھی مختلف صورتوں میں جاری ہے۔

لیکن ماضی کے اوراق پلٹیے تو کیا ان تمام مباحث کے پیچھے خود مسلمانوں کے اپنے افکار و اعمال نہیں ہیں؟ سلمان رشدی پر کیے گئے حملے نے پھر ۱۱/۹ کی مانند تعصبات کو ہوا دے دی ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا اثر، بلا مبالغہ، ادب اور نقد ادب دونوں ہی پہ ہو گا۔ ایسی صورت میں مذہب کی ہی بنیادوں پر کیا ایسے تنقیدی منہج کے زاویے متعین نہیں کیے جا سکتے جس کی زمینیں تمام مذاہب میں موجود انسان دوستی کے

عالمی پیغامات سے تیار کی گئی ہوں؟ ایسے رجحانات اردو میں موجود رہے ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی کا یہ بیان معنی خیز ہے کہ ”یہ ایک افسوسناک سچائی ہے کہ اردو کا تہذیبی تناظر یا اردو تہذیب تو دور کی بات ہے، ہم نے اپنے مجموعی طرز عمل کے لحاظ سے، خود تہذیب کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا“۔ زیر نظر شمارے کے اردو حصے میں شامل پروفیسر عرفان احمد کا مقالہ اسی ذہن سازی کی ایک مثال ہے۔

اردو اسٹڈیز کے چوتھے شمارے کی تیاری کے لیے انگریزی مقالات کی تمام تر ذمہ داری مہمان مدیر پروفیسر فاطمہ رضوی کے سپرد تھی۔ انھوں نے اپنی اردو نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جس محنت شاقہ، تندہی اور دلچسپی کے ساتھ اپنا تعاون دیا ہے اس کے لیے ادارہ ان کا سپاس گزار ہے۔ اردو اور انگریزی کے سبھی مضامین، مقالات و تراجم اپنے قلمکاروں کی دانشوری کی بہترین مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اردو کے قارئین کے لیے یہ سبھی تحریریں اس لیے اہم ہیں کہ ان سے اردو زبان و ادب اور تہذیب کے سلسلے میں معاصرین کی فکری روش، ان کے طرز استدلال اور تحقیقی معیار کی عالمی نمائندگی ہوتی ہے۔

اردو اسٹڈیز کے ہر شمارے کے لیے مقالوں کی جستجو سال بھر کا عمل ہوتا ہے۔ یہ عرض بیجا نہ ہوگی کہ پروفیسر فاطمہ رضوی کی دانشورانہ دیانتداری اور میرے شعبے کے رفقائے کار میں صدر شعبہ پروفیسر سمیع احمد اور جریدہ کے نائب مدیر ڈاکٹر مظہر کبریا کے بے لوث تعاون نے ادارتی نیز اشاعتی مراحل کو آسان بنا دیا۔ شیخ الجامعہ پروفیسر فاروق علی جریدے کے سلسلے میں ہمیشہ جس دلچسپی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں وہ ہمارے لیے تقویت کا باعث ہے۔

دانش گاہ کے مدارالمہام کی حیثیت سے جریدے کو شیخ الجامعہ کی سرپرستی تو حاصل ہے لیکن اس جریدے کی اشاعت میں کسی فرد یا ادارے کی مالی اعانت شامل نہیں ہوتی، اس لیے ہم اعزازی نسخے دینے سے قاصر ہیں۔

اگر نور خواہی بایست آتش روشن کنی

ارشد مسعود ہاشمی

پروفیسر، شعبۂ اردو،

جے پرکاش یونیورسٹی، چھپرہ (بھارت)